پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی ترجمہ شدہ کتاب ''جنم دن'' کا تجزیاتی مطالعہ

An Analytical Study of the Translated Book "Janam Din" by Professor Zia-ur-Rehman Siddiqui

غزالہ نورین* / ڈاکٹر صدف نقوی**

Abstract:

Professor Ziaur Rahman Siddiqui holds a distinct place in the literary world. He is a renowned scholar, insightful critic, and intellectual, as well as a successful and trustworthy translator. "Janam Din" is a testament to Professor Siddiqui's balanced and skilled approach to translation. Indeed, translation is a serious and challenging art. Transferring a text into another language while retaining its literary richness, emotional impact, and original essence is no less than drawing blood from stone. Yet, the professor has accomplished this task commendably, with his artistic finesse, symbolic insight, and complete mastery over language and expression.

"Janam Din" is an engaging collection of eight stories. Among these, Janam Din, Bhadari, and Phoolon Ka Mol are translations of Malayalam, Assamese, and Bengali stories respectively. The remaining five stories — Kubda Bhikhari (The Hunchback Beggar), Marg-e-Shajar (The Death of a Tree), Achhoot (The Untouchable), Khwahish (Desire), and Junoon (Madness) — are translations of stories by Ruskin Bond.

There is a charm in Professor Ziaur Rahman Siddiqui's style that

*ایم۔فل اسکالر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

**صدر شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد

captivates the reader. His writings are proof that he has richly infused the aesthetics of Urdu literature into his work. His texts display a beautiful blend of creative elegance and literary flavor, which even a general reader finds interesting. The literary delicacy and simplicity in his language reflect the true aesthetic values of Urdu. One of the strengths of his translations is that he embellishes even dry and difficult subjects with aesthetic qualities, adding a unique beauty to them.

A major characteristic of his translation work is fluency, simplicity, and clarity. He has expressed even the most complex subjects in such plain and accessible language that readers not only understand them easily but also form a deep connection with the themes. His style proves that one can convey strong and impactful ideas in literature without relying on complexity or exaggeration. Professor Siddiqui's translations have made things much easier for readers — both in terms of readability and comprehension.

Keywords: Ziaur Rahman Siddiqui, Translation, Urdu Literature, "Janam Din"

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی ادبی دنیا میں اپنی ایک منفرد شناخت کے حامل ہیں۔وہ ایک ممتاز، محقق، صاحب بصیرت ناقد اور دانشور کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب اور قابل اعتماد مترجم بھی ہیں۔"جنم دن" پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کو متوازن ترجمہ نگاری پر دال ہے۔یقیناً ترجمہ نگاری ایک سنجیدہ اور مشکل فن ہے۔کسی بھی متن کو دوسری زبان میں منتقل کرنا وہی ادبی رچاؤ وہی اثر اور وہی جذبہ برقرار رکھنا، جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔لیکن موصوف نے اپنی ترجمہ نگاری میں فن کاری، رمز شناسی اور زبان و بیان پر کامل دسترس کے امتیاز سے یہ کارنامہ بھی بخوبی انجام دیا ہے۔"جنم دن" آٹھ کہانیوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔جس میں جنم دن، بھداری اور پھولوں کا مول بالترتیب ملیالم، آسامی اور بنگالی کہانیوں کا ترجمہ ہے۔اور باقی پانچ کہانیاں یعنی "کبڑا بھکاری"، "مرگ شجر"، "اچھوت"، "خواہش" اور "جنون" رسکن بونڈ کی کہانیوں کے تراجم ہیں۔

مجموعہ میں شامل پہلی کہانی "جنم دن" میں بھوک اور افلاس میں مبتلا ایک مصنف کی خستہ حالی کو بیان کیا گیا ہے۔جو اپنے جنم دن پر بھوک کا شکار رہتا ہے۔اور اس بھوک کو مٹانے اور اپنے جنم دن پر خوشی و اطمینان حاصل

کرنے کے لئے مختلف خیالات اور تدابیر کے باوجود بھی پریشان اور مایوس ہی رہ جاتا ہے۔ دراصل ااس کہانی کے مرکزی کردار کے ذریعے دنیا کے تمام ناداروں، مفلسوں بے بس و بے سہارا عوام کی حالت زار کو صاحب ثروت کے زیر نظر لانے کی سعی کی گئی ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے بڑی خوش اسلوبی سے نفس مضمون کو من و عن پیش کیا ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے انہماک و انجذاب سے متن اور مصنف کے شعور کی تفہیم کے ساتھ قارئین کو اصل حقیقتوں اور معنوی تہوں سے باخبر کرنے کے علاوہ مرکزی کردار کی نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کا بااثر انکشاف کیا ہے۔ کہانی کا پلاٹ سادہ اور پر کشش ہے۔ شروع سے آخر تک قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ اور بغیر کسی اکتاہٹ کے قاری کہانی کے حدود جزر سے حذ حاصل کرتے ہوئے زندگی کے تلخ تجربات سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ یوں منظم اور مربوط پلاٹ کے سہارے قاری کو دعوت فکر دی گئی ہے۔ کہانی کا موضوع افلاس و محتاجی ہے۔ وہ افلاس جس نے سماج کے باشعور اور حساس طبقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار سی خاص طبقے کا ایک باشعور شخص ہے۔ جو اپنے سماج کے حالات و واقعات پر خامہ فرسائی کر کے سماجی حالات کو بہتر بنانے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ لیکن وہ خود کن حالات سے دوچار ہے۔ اس سے کسی کو کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔ مصنف نے مرکزی کردار کے ذہنی و جسمانی اضطراب و خلفشار کی ترجمانی میں جس بیض شناسی اور باریک بینی کا ثبوت دیا ہے۔ مترجم نے اس کو ہو بہو منتقلی اور اثر آفرینی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔ مترجم نے اپنے منفرد اسلوب کے ذریعے کہانی کو اصل انگریزی کے زیادہ قریب کیا ہے۔ اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ”سات بجے تھے مجھے یاد آرہا ہے کرسی پر آرام سے بیٹھے ہوئے میں نے سوچا، کم سے کم مجھے اس روز کسی غلط کام سے بچنا چاہیئے۔ اور آج کوئی غلط بات نہیں ہونی چاہیئے۔ آج کے "میں" کو میرے ان سینکڑوں رنگ بدلتے چہروں سے بالکل مختلف ہونا چاہیئے۔ جو ماضی کے سفید و سیاہ شب و روز میں نظر آرہے ہیں۔ آج میری عمر کتنی ہو گئی؟ پچھلے سال کے مقابلے میں ایک اور برس بڑا ہو گیا ہوں۔ پچھلے سال چھبیس (۲۶) نہیں بتیس (۳۲) یا سینتالیس (۴۷)۔“(۱)

مندرجہ بالا اقتباس میں مترجم نے منظر کشی بھی نہایت سلیقے سے کی ہے۔ سات بجے کا وقت بتایا ہے اور جس طرح سے کرسی پر بیٹھنا اور اس کا سوچنا بیان کیا گیا ہے یہ ایک اچھا مترجم ہی بیان کر سکتا ہے۔ اقتباس میں لفظ "میں" مترجم کی علمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ مصنف نے جس طرح سے ترجمہ کیا ہے اس کا دونوں زبانوں پر عبور ہے۔ جس طرح کا نمونہ مندرجہ بالا اقتباس میں پیش کیا گیا ہے۔ باقی ساری کہانیوں سے بھی اس طرح کا صاف انداز

بیان ہے۔ترجمہ نگاری کے لئے ایک مشکل یہ بھی ہوئی ہے۔ کہ ترجمہ کرتے ہوئے منشائے مصنف کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذات اور خیالات کو الگ نہیں رکھ سکتا۔ دو زبانوں کے درمیان ترجمہ نگار اپنی ذات کو الگ نہیں رکھ سکتا۔اس طرح اصل متن کی عبارت کی تفہیم میں بعض اوقات مترجم خود ایک رکاوٹ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مترجم اپنی ذہنی صلاحیت، رجحانات، ماحول اور تہذیبی پس منظر کے لحاظ سے عبارت کا مفہوم سمجھتا ہے اور اسی طرح عبارت کا ترجمہ بھی کرتا ہے۔ تراجم کی تاریخ میں مترجمین حضرات کی غلطیوں نے نا صرف سادہ نثر بلکہ بڑے مفکرین کی عبارات کا مفہوم کچھ کا کچھ کر دیا اور کافی عرصے کے بعد ان غلطیوں کی اصلاح ممکن ہو سکی۔اس حوالے سے پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے ترجمے کی بات کی جائے تو وہ باوجود کہیں کہیں اپنے حشو زوائد کے بہترین ترجموں کی فہرست میں آتا ہے۔ اگر ترجمہ نگار خالصتاً ترجمہ نگاری کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کرے تو ترجمہ میں بہت سی مشکلات مزید آجائیں گی۔ جبکہ مترجم کو کسی حد تک آزادی بھی ہوتی ہے۔ کہ وہ منشائے مصنف کو تبدیل کئے بغیر اپنے الفاظ و مفاہیم میں دوسری زبان میں منتقل کر دے۔ کہیں کہیں پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کا ترجمہ لفظی ترجمے سے بھی قریب تر ہو جاتا ہے۔ وہ منشائے مصنف کو پوری طرح دھیان میں رکھتے ہیں۔ اور لفظ بہ لفظ ترجمے میں لے آتے ہیں۔

دوسری کہانی "بھداری" کے عنوان سے ہے۔ بھداری جو ششورام کی باوفا بیوی ہے۔ اپنے تلخ و تند شوہر کی تمام تر سختیوں اور مظالم کو ہنسی خوشی برداشت کرتی ہے۔ ایک دن جب ششورام کھیت سے گھر لوٹتا ہے تو بھداری سے کھانا طلب کرتا ہے۔ گیلی لکڑیوں کے سبب کھانا تیار نا ہو سکا تھا۔ تو ششورام کے منہ سے بھداری اور اس کے خاندان سے متعلق تلخ و ترش الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں میاں بیوی کے درمیان جھگڑا شروع ہوتا ہے۔ اور بھداری اپنے شوہر کے ہاتھوں زخمی ہو جاتی ہے۔ اور اسپتال میں داخل کی جاتی ہے۔ اور ششورام کو قید کر دیا جاتا ہے۔ لیکن بھداری جو اپنے شوہر کی وفادار اور وفا شعار بیوی ہوتی ہے۔ اپنے شوہر کے جرم کو معاف کر دیتی ہے اور یہ بیان دیتی ہے کہ میں خود کیا درانتی سے ٹکرا گئی اور زخمی ہو گئی تھی۔ یہ سن کر ششورام پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور خود کو مجرم قرار دے کر پھانسی کے لائق سمجھتا ہے۔ ششورام کو تین ماہ قید کی سزا سنائی جاتی ہے۔ تو بھداری خود کو اس سب کا قصوروار سمجھ کر اپنے آپ پر لعنت ملامت کرتی ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کہانی کو اردو کا جامہ پہنا کر اس کی روح کو و قارئین کے ذہن و دل پر منعکس کیا ہے۔ موصوف نے اپنے ترجمے میں کرداروں کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیات کو تمام تر جزئیات کے ساتھ سامنے لایا ہے۔ سادہ اور سلیس انداز بیان میں کہانی کو مؤثر بنا کر یہ باور کیا ہے کہ کس طرح معاشی پسماندگی سے پیدا شدہ حالات ایک انسان کو جھنجھوڑ کر ظالم

اور بے رحم بنا دیتے ہیں۔ موصوف نے اس نزاکت کو مکمل فہم و فراست اور فنکارانہ مہارت سے اردو کا جامہ کا پہنا کر ترجمہ نگاری کے فن سے پوری طرح انصاف کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ اقتباس دیکھئے:

> ''بھداری چولہا پھونکتے پھونکتے عاجز آ گئی تھی۔ ششورام نے اس غضبناک آنکھوں سے دیکھا اور دور سے چلا کر کہا فلاں فلاں کی بچی تم نے ابھی تک کھانا کیوں نہیں بنایا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا دھوئیں سے منہ پھیرتے ہوئے بھداری نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ کیا میں اپنے سر سے کھانا بناؤں۔ گھر میں ایک بھی سوکھی لکڑی نہیں ہے۔ بغیر سوچے سمجھے تمہارا آپے سے باہر ہونا جائز ہے کیا کیا کہتی ہے کتیا کی بچی ششورام گرجا اور کندھے اچکاتا ہوا بھداری کی طرف لپکا اور زمین پر پڑی ہوئی درانتی اٹھا کر اس کی کمر پر مار دی۔ بے چاری بھداری خون میں لت پت بے ہوش پڑی تھی۔''(۲)

یہ مختصر کہانی اپنے وحدت تاثر اور جذبات نگاری کے سبب ایک عمدہ کہانی ہے۔ کردار نگاری میں مصنف نے احتیاط سے کام لیا ہے۔ بہتات کردار سے اجتناب کیا ہے۔ اور معاون کرداروں سے مناسب و موافق کام لیا ہے۔ مکالمے مختصر لیکن مؤثر اور جاندار ہیں۔ جن کے ذریعے کرداروں کی باطنی کیفیت اور ماحول و احوال کے ساتھ ان کی ذہنی نشو نما کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

اس اقتباس کو پڑھنے کے بعد ششورام کے منہ سے غصے کے وقت نکلنے والے الفاظ کی خوب نمائندگی کی گئی ہے۔ جو کہ دلچسپی میں اور انفرادیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ مزید یہ کہ اسلوب بیان کی انفرادیت مترجم کو دوسروں سے منفرد بناتی ہے۔ ہر مترجم اپنے زبان و بیان اور جملے کی ساخت و پرداخت کے اعتبار سے دوسروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے ہاں واقعات کے بیان کرنے کا اور منظر نگاری کرنے کا اپنا انداز پایا جاتا ہے۔ کسی بھی کہانی میں منظر نگاری سے انداز بیان میں چاشنی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ کہانی میں منظر نگاری صورتحال کا سہارا دیتی ہے لیکن ضرورت سے زیادہ منظر کشی کہانی کی اہمیت اور افادیت پر اثر انداز بھی ہو سکتی ہے۔ کہانی مختصر ہونے کے لحاظ سے کرداروں کے درمیان مکالمے بھی مختصر ہیں۔ لیکن مؤثر و جاندار ہیں۔ مصنف نے زیادہ کرداروں سے اجتناب کیا ہے اور معاون کرداروں سے کام لیا ہے۔

تیسری کہانی "پھولوں کا مول" میں لندن کے ایک ریستوران میں مسٹر گپتا کی ملاقات منگی سے ہوتی ہے۔ جس کا بھائی ہندوستان میں بحیثیت فوجی مامور اور بہت عرصے سے خط و کتابت نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ماں اور بہن بہت پریشان ہیں۔ منگی مسٹر گپتا کو اپنی ماں سے ملاقات کی خاطر اپنے گھر کے ساتھ لے جاتی ہے۔ تاکہ ماں کو

ہندوستان کے حالات و واقعات سے آگاہ کر کے اس کی پریشانی کو کئی حد تک دور کر سکے۔اس کہانی میں مصنف نے مذہبی اعتراضات اور توہم پرستی کی پر کشش ترجمانی کی ہے۔ جس کو مترجم نے بڑی ہی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔نا صرف اتنا ہی بلکہ موصوف نے جذبات نگاری میں بھی اپنے فن کاری کا مظاہرہ کر کے ترجمے کو زوردار بنا دیا۔موصوف نے توہم پرستی اور ضعیف الاعتقاد سے پیدا ہونے والی نفسیاتی و ذہنی کیفیت کو بھی منفرد انداز و اسلوب میں بیان کیا ہے۔

> ''فرینک نے جب یہ انگوٹھی بھیجی تھی مسز کلفرڈ نے کہا اس سے اس انگوٹھی کے بارے میں لکھا تھا اس کو دیکھتے وقت کسی دور افتادہ شخص کے بارے میں دھیان دو گے۔تو تمہیں یہ معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ آدمی کیا کر رہا ہے. یہ باتیں فرینک کو یوگی نے بتائی تھیں۔''(۳)

اس اقتباس کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جیسے مصنف نے کہانی لکھتے ہوئے محنت و ریاضت سے کام لیا ہے۔اسی طرح مترجمنے بھی خوب محنت اور لگن سے ترجمہ کیا ہے۔ مصنف کا کام ہوتا ہے کہانی لکھنا اور مترجم اس لکھی ہوئی کہانی کو ترجمہ کر کے دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ہر مترجم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ آسان سے آسان لفظوں میں ترجمہ کر کے قارئین تک پہنچائے۔ مترجم اصل کہانی کے متن سے دور نہیں ہو سکتا۔ مترجم ترجمہ کر کے کہانی کو مزید دلچسپ بنا رہا ہے۔ جس طرح وہ ترجمہ کرے وقت منظر نگاری اور مکالمہ نگاری کو بہتر طریقے سے پیش کرتا ہے۔ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ہم ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔ایسا ہی لگتا ہے کہ اصل کہانی کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی لفظ بہ لفظ ترجمہ کر کے کہانی کو مزید دلچسپ اور جاندار بنا دیتے ہیں۔اور ترجمہ کرتے وقت مشکل الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔اس مختصر کہانی میں مصنف نے مذہبی اعتقادات اور توہم پرستی کی پر کشش ترجمانی کی ہے۔ جس کو مترجم نے بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔اور صرف اتنا ہی نہیں مترجم نے جذبات نگاری میں بھی اپنی فنکاری کا مظاہرہ کر کے ترجمے کو زور دار بنا رہا ہے۔ مترجم نے ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو بھی منفرد انداز و اسلوب میں بیان کیا ہے۔ایک کامیاب مترجم ہی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو بیان کر سکتا ہے۔اور کہانی کی مکمل گہرائی کو قارئین تک ایک بہتر ترجمے کے ذریعے پہنچا سکتا ہے۔ مترجم اپنی پوری کوشش کرتا ہے۔ کہ کہانی کا گہرا مطالعہ کر کے اس کو آسان کر کے دوسروں تک پہنچائے تا کہ دوسروں کے لئے مصنف کی بات سمجھنے میں آسانی ہو اس مختصر سی کہانی میں ہندوستان کے حالات و واقعات بھی بتائے گئے ہیں۔اور مسٹر گپتا اور میگی کی ملاقات کا بھی منظر بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ کس طرح ایک ریستوران میں ملتے ہیں۔اور میگی اسے گھر لے جا کر اپنی ماں سے بھی ملواتی ہے۔

"کبڑا بھکاری" ایک نصیحت آموز اور دلچسپ کہانی ہے جس میں ایک گنپت لوگوں کو کہانیاں سنا کر پیسے حاصل کرتا ہے جسے بھیک مانگنے کا نیا طریقہ کہا گیا ہے۔ گنپت لکھا پڑھا آدمی ہے لوگوں کو اس کے بھیک مانگنے پر شک ہے اور اس سے متعلق بہت سی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں اور لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ افواہیں گنپت خود پھیلاتا ہے۔ گنپت تین کہانیاں ایک نوجوان کو سناتا ہے۔ وہ بعد از عقل اور ناقابل یقین ہے۔ مگر اس کہانی سے جو نصیحتیں اسے ملتی ہیں۔ وہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ مثلاً انسانوں سے محبت کرنا دشمن پیدا ہی نہ کرنا، خوہشات کے پیچھے نا بھاگنا، وقت کی قدر کرنا، اور ایمانداری سے ہر کام انجام دینا وغیرہ۔ کہانی کا مرکزی کردار گنپت راوی کو اپنی کہانی سناتا ہے۔ جس کے عوض راوی سے ایک روپیہ دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ گنپت کی کہانی بڑی دلچسپ ہے جس کے ذریعے اس وقت کی سماجی زندگی اور ایمان و اعتقاد کے ساتھ ساتھ فطرت انسانی عناصر سامنے آجاتے ہیں جو ہر کسی شخص میں کم و بیش پائے جاتے ہیں۔ یعنی بغذ، حسد، لالچ، شک وشبہ وغیرہ۔

> "میرے پاس پیسے آنے شروع ہو گئے اور اتنے پیسے آ گئے کہ میں نے بہت سی زمین اور مویشی خرید لئے۔ اس راز کو کسی کو نہیں پتا تھا ظاہر ہے کہ میرے دوستوں اور رشتہ داروں کو حیرت تھی کہ میرے پاس اتنا پیسہ اچانک کہاں سے آ گیا۔ ادھر میری بیوی بھی پریشان تھی کہ میں اس سے الگ کیوں سوتا ہوں۔ اس نے گھر کے اس بارے میں دوسرے لوگوں کو بتایا دوسرے دن میرے سسرال کے کچھ لوگ میرے گھر آ گئے اور انہوں نے گھر سے باہر مویشی خانے میں سونے کی وجہ معلوم کی۔ چاچا، چاچی، بھائی، بھتیجے اور گاؤں کے دوسرے لوگ بھی یہی جاننے کے خواہش مند تھے کہ میرے پاس اتنی دولت کہاں سے آرہی ہے۔ اور ابھی وہ اس دولت کا کچھ حصہ (لینے) لینا چاہتے تھے۔"(۴)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے کہانی کے سیاق و اسباق کو اردو کے قالب میں ڈھال کر مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔ اور قارئین کے لئے سبق آموز باتیں سلجھے ہوئے انداز و اسلوب میں بیان کی گئی ہیں۔

یہ کہانی دلچسپ اور سبق آموز کہانی ہے۔ کہانی مرکزی کردار گنپت کے گرد ہی گھومتی ہے۔ گنپت کا چہرہ وجیہہ، آنکھیں بارعب اور لمبی سفید داڑھی تھی۔ اور آواز میں بہت جان تھی۔ گنپت ایک فقیر تھا۔ اور اس کا مانگنے کا طریقہ دوسرے بھکاریوں سے مختلف تھا۔ یہ لوگوں کو کہانی سنا سنا کر پیسے اکٹھے کرتا تھا۔ اس کی انگریزی بھی اچھی تھی۔ یہ لوگوں کو شیکسپیئر کے کچھ بند بھی سنایا کرتا تھا۔ براہ راست بھیک نہیں مانگتا تھا۔ انسانی فطرت کی برائیوں پر گفتگو شروع کرتا تھا۔ اور تب تک گفتگو جاری رہتی تھی جب تک اس کو ایک سکہ نا مل جاتا۔ جس طرح مصنف نے

اس کہانی کو لکھا ہے اسی طرح مترجم نے بھی اس کو ترجمہ کر کے اس کو مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔اس کہانی سے سبق آموز باتیں ملتی ہیں۔جو کہ گنپت لوگوں کو نصیحت کرتا تھا اور وہ جو بھی نصیحت کرتا تھا وہ سب کچھ حقیقت میں ہوتا تھا۔مصنف تو اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہے کہ کہانی دلچسپ ہو لیکن مترجم اس کو ترجمہ کر کے زیادہ دلچسپ بنا دیتا ہے۔کچھ لوگوں کی انگریزی اچھی نہیں ہوتی لیکن انہیں مطالعہ کرنے کا شوق بہت زیادہ ہوتا ہے۔تو وہ انگریزی کہانیوں کے تراجم پڑھ کر اصل کہانی والا لطف حاصل کرتے ہیں۔جو کہ ایک اچھا اور کامیاب مترجم اچھا ترجمہ کر کے دے سکتا ہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کو ترجمہ نگاری کے فن پر کامل قدرت کے سلیقے سے بخوبی واقف ہیں۔وہ کہانی کو سیاق وسباق کے ساتھ ساتھ جذبہ واثر سے مملو زبان واسلوب عطا کر کے ان کو اردو زبان میں منتقل کرتے ہیں۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے تراجم کو پڑھ کر کبھی بھی ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کہانی ترجمہ شدہ ہے بلکہ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی خود کی لکھی گئی کہانی ہے وہ اس قدر لگن اور محنت سے کام کرتے ہیں۔

"مرگ شجر" میں سڑک نکالنے کے لئے پہاڑوں کو چھانٹنا اور درختوں کی بے دریغ کٹائی سے لاحق ہونے والے خطرات اور ماحول پر اس کے مضر اثرات کو کہانی کے مرکزی خیال کے بطور پیش کیا گیا ہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنے ترجمے میں جو منظر کشی کی ہے وہ ان کی ہنر مندی اور زبان وبیان پر دسترس کی واضح دلیل ہے۔

> "میرے گھر کے قریب چھوٹی سی جگہ میں ہی شاہ بلوط کے بیس (۲۰) درخت گرا دیئے گئے اور یہ سڑک دیکھتے ہی دیکھتے جہاز کے کھیت تک پہنچ گئی جو یہاں سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ہے۔ٹھیک ہے میں اب یہیں رہ کر اس تباہ کن پہاڑی کا نظارہ کروں گا۔راکیش پیپل کو تتلیوں والا درخت کہتا تھا۔کیونکہ اس درخت کے جب پنکھ والے بیج اڑتے تو وہ ہوا میں ادھر ادھر اڑتے ہوئے تتلیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔اب ناکوئی پیپل باقی رہ گیا۔نہ چمکدار سرخ پتے۔آسمان کی جانب اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور نہ کوئی پرندہ۔"(۵)

منظر کشی کے ساتھ ساتھ درختوں کے کٹان سے ماحول ومناظر پر جو مضر اثرات مرتب ہوئے ہیں۔اس سب کی طرف قاری کو بڑی پختگی کے ساتھ دعوت فکر دینے میں بھی کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔اسلوب بیان اتنا جاندار ہے کہ ہر لفظ سے ادبی چاشنی اور مٹھاس کے پیمانے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔یوں سماج وماحول کی عکاسی اس منظم اور مربوط طریقے سے کی گئی ہے۔کہ انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں

کے اور پرندوں کے مصائب و مشکلات جو درختوں کی کٹوتی کی بنا پر رونما ہوئے ہیں۔ قاری کے ذہن و دل پر اپنی چھاپ مرتسم کرتے ہیں۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنی تحریروں میں ادب کی روح اور اردو زبان کا احترام برقرار رکھا ہے۔ان کی تحریروں میں اردو زبان کے قدیم اور خالص الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔اور جدید زبان کی باریکیوں کو بھی بخوبی جانتے ہیں۔ان کی نثر میں اردو ادب کی اصل روح اور زبان کی قدیم روایت کی جھلک لگتی ہے۔جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اردو زبان کی گہرائیوں کو سمجھا اور اس میں ادبی خوبصورتی کو اجاگر کیا۔ان کے اسلوب میں ایک تسلسل سے جو قاری کو قدم بہ قدم اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کے مضامین میں خیالات کے درمیان کوئی خلا نا ہو،اور ان کا ہر جملہ پچھلے جملے کو تقویت پہنچائے۔

"اچھوت" ایک مختصر کہانی ہے۔جس میں غریبوں کے تئیں امیروں کے نازیبا سلوک کو بیان کر کے سماجی حالت اور عوامی اذہان کی ترجمانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔مترجم نے اپنے علم، مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر کہانی کو اثر انگیز بنا کر پیش کیا ہے۔کہانی کے مطالعے کے دوران موصوف کی زبان دانی اور مہارت کا احساس ہوتا ہے۔

یوں آسان اور عام و فہم زبان میں ترجمہ پیش کر کے سماجی زندگی کی تلخ حقیقت کو قارئین کے ذہن و دل پر نقش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔موصوف نے کہانی کو نیا جامہ پہنا کر یہ واضح کیا ہے کہ رنگ و نسل ذات پات اور مقام و منصب سے انسان دوستی، محبت و بھائی چارہ بالاتر ہے۔کہانی کا راوی ایک بڑے آدمی کا بیٹا ہے جو اپنے گھر کی صفائی کرنے والے لڑکے کو صرف اس وجہ سے پسند نہیں کرتا ہے کیونکہ وہ غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔اس صفائی کرنے والے کو دوسرے لڑکے بھی نہیں پسند کرتے ہیں۔اور ان کے ماں باپ بھی انہیں اس سے دور رہنے کی ترغیب دیتے ہیں۔اس کہانی کے ذریعے اس بات کی صراحت کی گئی ہے۔خدمت گزار طبقے کی حثیت ان کے آقاؤں کے نزدیک محض خادموں کی ہوتی ہے،انسانوں کی نہیں۔اس کے علاوہ اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بڑے لوگوں کے تعلقات اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کیسے ہوتے ہیں۔ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ بڑے لوگوں کے بچے نوکروں کے بچوں کے ساتھ نہیں کھیل سکتے۔

کہانی "خواہش" میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ ایک انسان آزادی سے اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے۔جس کے لئے مشکلات کا سامنا کرنا ناگریز اور صبر و تحمل سے کام لینا از حد ضروری ہے۔حد درجہ، احتیاط برتنے

سے آزادی تو برقرار رہ سکتی ہے۔ لیکن ہر خواہش کی تکمیل ناممکن ہے۔ کیونکہ ایک خواہش کے بعد دوسری خواہش جنم لیتی ہے۔ اور یہ سلسلہ مرتے دم تک جاری رہتا ہے۔ چوں کہ انسان لالچی ہوتا ہے، اور وہ زیادہ سے زیادہ پانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اور آخر کار اپنی لالچ کا شکار ہو کر سب کچھ کھو دیتا ہے۔ اس کہانی کو ایک بوڑھے فقیر اور ایک لڑکے کی گفتگو کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

> ''ہاں یہ سب کچھ بڑی آسانی سے کھو بھی سکتا ہے اور کوئی تم سے چھین بھی سکتا ہے، یا تم لالچی اور لاپرواہ ہو جاؤ گے اور پھر اچانک تمہارا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا۔ تم یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو کیونکہ میرا بھی ایک خواب تھا جو پورا نہ ہو سکا۔ کہا تمہارا سب کچھ ختم ہو گیا۔''(۲)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے نفس مضمون کی ادائیگی میں مناسب اسلوب سے کہانی کو مؤثر بنا کر انسانی جذبات اور خواہشات کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ کہانی مختصر سہی، مگر اپنے معنی خیز اور نصیحت آمیز موضوع کے تحت ایک دلچسپ کہانی ہے۔ جس میں کرداروں کی نفسیات کا مطالعہ اس باریک بینی سے پیش کیا گیا ہے کہ ان کے ظاہر و باطن سے قاری باخبر ہو کر اس دور کی سماجی حالت سے بھی آشنا ہو جاتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اپنی تحریروں میں ادب کی روح اور اردو زبان کا احترام برقرار رکھا ہے۔ ان کی تحریروں میں اردو زبان کے قدیم اور خالص الفاظ کا استعمال بھی ملتا ہے۔ اور جدید زبان کی باریکیوں کو بھی بخوبی جانتے ہیں۔ ان کی نثر میں اردو ادب کی اصل روح اور زبان کی قدیم روایت کی جھلک ملتی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اردو زبان کی گہرائیوں کو سمجھا اور اس میں ادبی خوبصورتی کو اجاگر کیا۔ ان کے اسلوب میں ایک تسلسل ہے جو قاری کو قدم بہ قدم اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔ پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ان کے مضامین میں خیالات کے درمیان کوئی خلا نہ ہو اور ان کا ہر جملہ پچھلے جملے کو تقویت پہنچائے۔

اسی طرح کہانی جنون ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے پیدا شدہ صورتحال پر مختصر ایک کہانی ہے۔ جس میں دہلی، شاہ جہان پور، میرٹھ، بجھ پور اور دوسرے کئی شہروں میں انگریزوں اور دوسرے کئی مسلمانوں کے درمیان معرکہ آرائی سے رونما ہونے والی لوٹ کھسوٹ، دہشت اور قتل و غارت گری کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ کہانی ایک اینگلو انڈین گھرانے کے گرد گھوم کر پورے ہندوستان کی سیر کراتی ہے۔ اس خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی جان

بچانے کی خاطر جن اذیتوں اور مصائب و مشکلات کے شکار ہوتے ہیں۔ ان سے اس وقت کے انسان کی وحشت اور زندگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کہانی کے آغاز سے ہی یہ مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں:

> ''شدت کی گرمی پڑ رہی تھی جب ۱۰ مئی کو میرٹھ میں بغاوت ہو گئی۔ سپاہیوں نے اپنے ہی انگریز افسروں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ شہر میں بھی لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ جیل کے دروازے توڑ دیئے گئے اور ہتھیار بند قیدی شہر اور چھاؤنی میں بسے ہوئے انگریزوں پر بل پڑے۔ ان کے گھروں کو آگ لگا دی گئی اور لوگوں کو قتل کر دیا۔''(۷)

واقعات و حادثات اور کرداروں کی بہتات کے باعث کہانی کا پلاٹ پیچیدہ اور غیر منظم ہے۔ تاہم کہانی کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے پلاٹ میں ربط و تسلسل برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بادشاہ، نوابوں اور سپاہیوں کی حالت ان کی ذہنیت اور جذباتی وفور کے ساتھ ساتھ عوام کی سوچ و فکر، سماجی و معاشی حالت اور مذہبی و ثقافتی اقدار کی ترجمانی جس خوش اسلوبی اور باریک بینی سے اردو کے لباس میں منتقل کی گئی ہے۔ وہ ترجمہ نگاری کی فنکاری کا مین ثبوت ہے۔ بغاوت سے رونما ہونے والی صورتحال کا نقشہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ہنروری اور چابکدستی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے۔ کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں اور جذبات و احساسات کی گہرائیوں سے کہانی کو مؤثر بنا کر اس کی سماجی اور سیاسی خلفشار انتشار کو منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ جس میں ہر سو خونی مناظر برپا کئے ہیں۔

جرسی لباڈور، مریم، پلو، لال رام جی لال، جاوید خان، خان بیگم، میجر گھنشام، سنگھ، بوڑھی چاچی، منگل خان، سرفراز، حشمت، کامران، بدرن، عبدالرؤف، وغیرہ جیسے متعدد کرداروں کے ذریعے مختلف طبقوں کی نہ صرف بغاوت اور آزادی سے وابستہ جذبات و احساسات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ منظر کشی کی ایسی مثالیں کہ قاری خود کو محو نظارہ پاتا ہے۔

> ''آفتاب صاف و شفاف چمکدار آسمان میں اگ آیا تھا اور خوش قسمت تھے وہ لوگ جو پو پھٹے ہی اٹھ گئے تھے۔ اور دریا کی طرف سے آرہی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ سات بجے گرجا بھر کا گھنٹا بج اٹھا۔ لوگ چھاؤنی میں بنے اس چھوٹے سے مضبوط گرجا کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ لباڈور اس کی بیٹی کی طرح اتوار کی پوشاک پوشاک میں پیدل چل رہے ہیں۔ کچھ بگھیوں پر سوار تھے یا پالکیوں میں سوار تھے۔ جنہیں پسینے سے تر کہار کندھوں پر اٹھائے ہوئے دوڑ رہے تھے۔''(۸)

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے اسلوب میں ایک ایسی دلکشی ہے جو قاری کو متاثر کرتی ہے اور ان کی تحریریں اس بات کی گواہ ہیں کہ انہوں نے اردو ادب کی جمالیات کو بھرپور انداز میں سمویا ہے۔ان کی تحریروں میں تخلیقی حسن اور ادبی چاشنی کا ایسا امتزاج ملتا ہے۔کہ ایک عام قاری بھی ان کے مضامین میں دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ان کی زبان میں جو ادبی لطافت اور سادگی ہے وہ اردو زبان کی حقیقی جمالیاتی قدر کو سامنے لاتی ہے۔ان کے ترجمے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کسی خشک مضمون کو بھی جمالیاتی خوبیوں سے مزین کرتے ہیں۔جس سے منفرد خوبصورتی کا پہلو شامل ہو جاتا ہے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے ترجمے کی ایک بڑی خصوصیت ان کی روانی، سادگی اور شفافیت ہے۔انہوں نے انتہائی پیچیدہ موضوعات کو بھی ایسی سادہ زبان میں بیان کیا ہے۔کہ قاری کو نہ صرف سمجھنے میں آسانی ہوئی ہے بلکہ موضوع کے ساتھ گہرائی سے تعلق بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ان کا اسلوب اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب میں پیچیدگی یا مبالغہ آرائی کے بغیر بھی ایک مضبوط اور مؤثر بات کہی جا سکتی ہے۔پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی کے تراجم نے قارئین کے لئے بہت آسانی کر دی ہے۔ان کے لئے پڑھنے اور سمجھنے میں بہت آسانی ہو گئی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ضیاء الرحمٰن صدیقی، پروفیسر، جنم دن (ترجمہ): پبلی کیشنز ڈویژن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۱۹ء، ص۹

۲۔ ایضاً، ص ۳۲

۳۔ ایضاً، ص۳۶

۴۔ ایضاً، ص۵۷

۵۔ سہ ماہی ورثہ، نیویارک، جلد نمبر ۴، شمارہ نمبر، اپریل تا جون ۲۰۲۴ء، ص ۷۳

۶۔ ایضاً، ص ۷۳

۷۔ ایضاً، ص ۷۴

۸۔ ایضاً، ص ۷۴